حَنِيفًا کے معنی اور مفہوم

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور آقائے نامدار ﷺ کیلئے قرآنِ مجید میں حَنِيفًا کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ قرآنِ مجید میں حَنِيفًا دس (۱۰) مرتبہ اور اس کی جمع حُنَفَآءَ دو مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ مختلف اہل علم کی جانب سے اس کے معنی کچھ یوں ملتے ہیں:

''ایک طرف ہونے والا، حنف (مادہ ''ح ن ف'') سے جس کے معنی گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونے کے ہیں، جو کوئی راہ حق پکڑے اور سب باطل راہیں چھوڑے''۔

''الحَنَف'' پاؤں کا ٹیڑھا اور مڑا ہوا ہونا۔ اسی سے حنیف اسے کہتے ہیں جو غلط راستے سے ہٹ (مڑ) کر سیدھی راہ پر آجائے۔

تاج، محیط، راغب نے کہا ہے کہ گمراہی سے ہٹ کر استقامت (صراط مستقیم) کی طرف مائل ہونے کو کہتے ہیں۔

اس میں یکسو ہونے کا مفہوم غالب ہے۔

تفسیر المنار میں ہے کہ حنیف لغت میں مائل کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس لفظ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے زمانے میں لوگ طریقہ کفر کی پیروی کرتے تھے۔ انہوں نے ان سب کی مخالفت کی اور ان کے طریقہ سے ہٹ کر دین مستقیم اختیار کر لیا''

ارباب لغت، روایت اور جدیدیت پسند مفسرین سب کا ادب واحترام اپنی جگہ لیکن انہوں نے بھی یہ معنی اور مفہوم لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ کے فلسفے کو مدنظر رکھ کر اخذ کرنے کی بھول کی۔ ارباب لغت کے حَنِيفًا کے بیان کردہ معنی اور مفہوم میں وزن اور تاثر اس بات پر ہے کہ ایسا شخص وقت کے ایک مقام پر گمراہی اور باطل راہ پر ہوتا ہے اور وقت کے ایک دوسرے مقام پر اُسے چھوڑ کر سیدھی راہ کیطرف مڑتا ہے اور استقامت (صراط مستقیم) پر مائل ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید کے بارہ کے بارہ مقام جہاں اصطلاح حَنِيفًا اور حُنَفَآءَ استعمال ہوئی ہے ارباب لغت کے اس خیال کی پرزور نفی کرتے ہیں۔ حَنِيفًا ایسا شخص نہیں ہوتا جو گمراہی سے استقامت کی طرف مائل، غلط راستے سے ہٹ کر (مڑ کر) سیدھی راہ پر آتا ہے بلکہ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ یعنی ''اللہ الٰہ ہے'' پر پہلے سے قائم ہوتا ہے۔ اور اس کی ضد وہ شخص ہوتا ہے جو مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنے ہی تراشے ہوئے بتوں کو تخیل سے نام دے کر انہیں اِلٰہ سمجھتا اور قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے مختص بندوں، رسولوں کے انداز بیان میں کمال اور لطافت یہ ہے کہ وہ بات کو ''فصل''، یعنی الگ الگ کر کے بیان کرتے ہیں کہ سامع کیلئے رشد اور کج الگ اور

واضح ہوتے چلے جائیں۔اس لئے وہ جب بھی حَنِيفًا کا ذکر کریں گے تو اسے اس کی ضد، کج سے ممیّز کرنے کیلئے کہتے ہیں
وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ''اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا''۔ اس انداز بیان میں جو حقیقت، اثبات ہے اسے پہلے بیان کیا گیا اور جو حقیقت نہیں اس کی نفی بعد میں کی گئی جس نے پہلے بیان کی گئی حقیقت کی پُرزور تصدیق بھی کر دی۔سبحان اللہ! اللہ رب العزت کے دوست ابراہیم علیہ السلام اور اس کے دوسرے تمام انبیاء کرام علیہم السلام منصب رسالت پر فائز ہونے سے قبل بھی ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ یعنی ''اللہ الٰہ ہے'' پر قائم تھے۔ان تمام کو عقیدت وادب سے ہماری جھکی نگاہوں کے ساتھ سلام ہو۔

قرآنِ مجید میں حَنِيفًا کے معنی اور مفہوم کی تلاش سے قبل ایک واقعہ دیکھتے ہیں جس سے ہمیں اس کی روح معلوم ہو جائے گی ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں ایک جلیل القدر رسول موسیٰ علیہ السلام ہیں۔اپنے اہل خانہ کے ساتھ نہ معلوم منزل کی جانب محوسفر ہیں۔ انہیں دور آگ دکھائی دیتی ہے۔اہل خانہ کو بٹھا کر اس مقام کی طرف جاتے ہیں جہاں انہیں آگ دکھائی دی تھی۔انہیں پکارا گیا:
يَٰمُوسَىٰٓ إِنِّيٓ أَنَا ٱللَّهُ رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ''اے موسیٰ! بیشک میں اللہ ہوں، سارے جہانوں کا رب'' (حوالہ القصص۔۳۰)۔ موسیٰ علیہ السلام نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں ہیں کہ مجھے آپ دکھائی نہیں دے رہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں پوچھا؟ اس لئے کہ حَنِيفًا ہیں، اللہ رب العالمین کو جانتے اور مانتے ہیں۔اور اگر قرآنِ مجید میں محفوظ کی گئی اللہ رب العزت اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے مابین ہونے والی اس دن کی گفتگو کو معمولی دھیان سے بھی سنیں تو اس مخصوص بے تکلفی کا احساس ہوگا جو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے درمیان ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی شئے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کمال سادگی اور بے تکلفی سے اپنی لاٹھی (عصا) کے متعلق ایک اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔سبحان اللہ، حمد اللہ کیلئے ہے اور سلام ہو اس کے تمام رسولوں پر۔لیکن جو انسان حَنِيفًا نہیں بلکہ مشرک ہے اسے رب العالمین کے متعلق بتایا جائے تو کہتا ہے
قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَٰمُوسَىٰ ﴿٤٩﴾ ''اس نے کہا ''اچھا! تمہارا رب کون ہے اے موسیٰ (علیہ السلام)!'' (طٰہٰ۔۴۹)
قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٢٣﴾ ''فرعون بولا'' مگر سارے جہانوں کا رب کیا ہوتا ہے؟'' (الشعراء۔۲۳)

انسان زمین پر آمد کے بعد جتنے عرصہ تک حَنِيفًا رہے تھے انہیں یہ بات لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ بتانے کی نوبت آئی تھی اور نہ ضرورت تھی کیونکہ کسی غیر موجود شئے اور ہستی کی نفی کرانے کا سوال اس وقت اٹھتا ہے جب کوئی اس کے موجود اور ہست ہونے کے متعلق غیر حقیقی گمان کرنے لگے۔ اس کلمے لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ کے دو حصے ہیں۔اول لَآ إِلَٰهَ ''اِلٰہ کوئی بھی نہیں''۔یہ نفی کا پہلو ہے یعنی

اس حقیقت کا اعتراف کہ کائنات میں کوئی طاقت، شئے، ہستی ایسی نہیں ہے جسے اِلہٰ تصور اور تسلیم کیا جا سکے۔ اور کلمے کا دوسرا حصہ إِلَّا ٱللَّهُ یہ ایجابی پہلو ہے، اثبات اور اقرار کہ ایسا نہیں ہے کہ کائنات میں کوئی اِلہٰ ہے ہی نہیں۔ اللہ اِلہٰ ہے۔ موجود اور حقیقت کا اعتراف اور اقرار کرایا جاتا ہے۔ لیکن عدم کی نفی کا اعتراف اور اقرار کرانا ایک بے معنی بات ہے۔ حقیقت کے علاوہ کسی دوسرے اِلہٰ کا گمان اور تصور اگر ناپید ہے تو اس کی نفی یعنی لَآ إِلَٰهَ کرانے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے زمین پر موجود قدیم ترین انسانوں سے صرف موجود اور حقیقت کا اعتراف اور اقرار کرایا گیا تھا۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں بتایا:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنۢ بَنِىٓ ءَادَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

''اور جب تیرے رب نے آدم (علیہ السلام) کی اولاد کی نسلوں کی اولاد سے عہد لیا

وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا۟ بَلَىٰ شَهِدْنَآ

اور انہیں اس پر کہ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' گواہ کیا تو انہوں نے کہا ''کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو رب ہے''۔

دوستو! آئیں اپنے ان قدیم آباؤ اجداد کو ہم سلام کہیں اور گواہی دیں اور اقرار کریں اس سچائی کا کہ ہمارے قدیم ترین آباؤ اجداد نے شرک نہیں کیا تھا کہ ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار کرانے کا اللہ رب العزت کا مقصد بھی یہی تھا

أَن تَقُولُوا۟ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَٰفِلِينَ

''کہ تم (یعنی ہم جو زمان میں ان کے بعد آئے) کہیں روز قیامت یہ نہ کہہ دو کہ ''ہم اس بات سے بے خبر تھے''

أَوْ تَقُولُوٓا۟ إِنَّمَآ أَشْرَكَ ءَابَآؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنۢ بَعْدِهِمْ ۖ

''یا یہ کہہ دو کہ ''ہمارے باپ دادا پہلے سے ہی شرک کرتے تھے اور ہم تو ان کے بعد ان کی نسل تھے۔

أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ ٱلْمُبْطِلُونَ ۝

تو کیا (ہمارے رب) تو ہمیں ہلاک کر دے گا اس پر جو غلط کاروں نے کیا؟'' (الاعراف۔۱۷۳)

یارب! ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے قدیم آباؤ اجداد نے سچ کہا تھا کہ ان کا اور ہمارا رب تو ہے۔ یارب! یہ سچ اور حقیقت ہے کہ ہمارے قدیم ترین آباؤ اجداد نے شرک نہیں کیا تھا۔

اللہ رب العزت علم کا مالک ہے۔ اور ہر شئے کے بارے میں علم کتاب مبین میں لکھا ہے۔ اور قرآنِ مجید کتاب مبین ہے۔ اور تمام تعریف اللہ کیلئے ہے جس نے کتاب مبین نازل فرمائی میرے آقا، آقائے نامدار، رحمت للعالمین رسولِ کریم ﷺ کے قلب مبارک پر

وَءَامَنُواْ بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّهِمۡ

''اور اس (قرآنِ مجید) پر ایمان لائے جو محمد ﷺ پر نازل فرمایا گیا ہے اور ان کے رب کی جانب سے وہی بیانِ حقیقت ہے'' (محمد ﷺ۔۲)

آقائے نامدار ﷺ بھی ان جلیل القدر ماں باپ کے بیٹے ہیں جنہیں اس سے قبل کتاب نہیں دی گئی تھی اور جنہیں خبردار نہیں کیا گیا تھا۔

آقائے نامدار ﷺ کے جلیل القدر والدین کو ہمارا اسلام ہو۔ آقائے نامدار ﷺ کو ٱلنَّبِيَّ ٱلۡأُمِّيَّ کہا گیا ہے

وَمَا كُنتَ تَرۡجُوٓاْ أَن يُلۡقَىٰٓ إِلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبُ إِلَّا رَحۡمَةٗ مِّن رَّبِّكَۖ (حوالہ القصص۔۸۶)

''اور آپ (ﷺ) تو اس جستجو را امید میں نہ تھے کہ آپ کو کتاب عنایت کی جائے، مگر (اس کا نزول) یہ آپ (ﷺ) کے رب کی رحمت تھی''

وَكَذَٰلِكَ أَنزَلۡنَٰٓهُ قُرۡءَانًا عَرَبِيّٗا

''اور اس لئے ہم نے آپ (ﷺ) پر کتاب نازل کی ہے''۔ اور اس آیت کے آخر میں فرمایا

وَمَا يَجۡحَدُ بِـَٔايَٰتِنَآ إِلَّا ٱلۡكَٰفِرُونَ ٥

''اور ہماری آیتوں کا جانتے بوجھتے ہوئے انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں'' (حوالہ العنکبوت۔۴۷)

قرآنِ مجید کے نزول سے قبل ٱلۡأُمِّيِّـۧنَ کے دونوں معنی آقائے نامدار ﷺ کی ذات اقدس پر صادق آتے ہیں یعنی ان میں سے ہونا جنہیں پہلے کتاب نہیں دی گئی تھی اور ان پڑھ ہونا۔ دانستہ انکار کرنے والوں کے متعلق واضح فرمایا

وَمَا كُنتَ تَتۡلُواْ مِن قَبۡلِهِۦ مِن كِتَٰبٖ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَۖ إِذٗا لَّٱرۡتَابَ ٱلۡمُبۡطِلُونَ ٤٨

''اور آپ (ﷺ) اس کتاب کے نزول سے قبل نہ کتاب میں سے پڑھنا جانتے تھے اور نہ دائیں ہاتھ سے لکھنا جانتے تھے کہ باطل راہوں پر چلنے والوں کیلئے (اس کتاب کو ماننے کیلئے) کوئی التباس ہوتا'' (العنکبوت۔۴۸)

بَلۡ هُوَ ءَايَٰتُۢ بَيِّنَٰتٞ فِي صُدُورِ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡعِلۡمَۚ

بلکہ یہ (قرآنِ مجید کی) روشن آیات ہیں جو ان کے سینوں میں ہیں جنہیں علم عطا کیا گیا ہے۔

وَمَا يَجۡحَدُ بِـَٔايَٰتِنَآ إِلَّا ٱلظَّٰلِمُونَ٥

اور ہماری آیتوں کا جانتے بوجھتے ہوئے انکار بجز ظالموں کے کوئی نہیں کرتا'' (العنکبوت۔۴۹)

وَمَا يَجۡحَدُ بِـَٔايَٰتِنَآ إِلَّا كُلُّ خَتَّارٖ كَفُورٖ ٥

''اور سوائے ہر عہد توڑنے والے ناشکرے کے ہماری آیات (نشانیوں) کا کوئی انکار نہیں کرتا'' (حوالہ لقمان۔۳۲)

''یَجْحَدُ'' کا مادہ ''ج ح د'' ہے اور اس کے معنی جان بوجھ کر انکار کر دینا ہیں۔ جناب راغب اور صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس چیز کا انکار کر دینا ہے جس کا اقرار دل کے اندر ہو اور اس کا اقرار کرنا جس کا انکار دل کے اندر ہو۔ یہ ایسا انکار ہے جو کسی شک وشبہ کی بناء پر نہ ہو بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے محض ضد اور سرکشی کی بناء پر ہو۔

وَجَحَدُواْ بِهَا وَٱسْتَيْقَنَتْهَآ أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا

''اور انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے ظلم اور سرکشی سے انکار کر دیا، اگرچہ ان کے دلوں نے ان پر یقین کر لیا تھا'' (حوالہ النمل۔۱۴)

اگر اللہ کا کوئی ایسا بندہ جو دانشور، مفکر اور عالم کے طور پر مشہور ہو یہ کہے کہ جو باتیں اب وہ سنا اور بتا رہا ہے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب میں سے ہیں تو ان باتوں کا انکار کوئی شخص شک، التباس اور الجھاؤ کی بناء پر بھی کر سکتا ہے کہ ممکن ہے یہ باتیں بھی اس کی اپنی ہوں۔ لیکن اگر یہ بندہ وہ ہو جسے کتاب کے نزول سے قبل کتاب کو پڑھنا اور لکھنا بھی نہ آتا ہو تو باطل راہوں پر چلنے والوں کیلئے بھی اُن کی بات کو تسلیم کرنے کیلئے کسی شک اور ریب کی گنجائش نہیں ہوتی اور ان کا انکار محض ضد کی بناء پر دانستہ ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے نزول سے قبل آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا اور پڑھنے لکھنے پر عبور انہیں نزول قرآنِ مجید سے ہوا۔ ایک اور بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ دائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ إِذًا لَّارْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ o کہ اگر آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ کو قرآنِ مجید کے نزول سے قبل کتاب پڑھنے اور لکھنے پر عبور حاصل ہوتا تو باطل باتوں میں محو رہنے والوں کیلئے اسے ماننے سے انکار کرنے کا ایک بہانہ یہ ہو سکتا تھا کہ انہیں شک، ریب، الجھاؤ، التباس ہے کہ شاید کتاب ان کی اپنی تصنیف ہو۔ آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ کو قرآنِ مجید کے نزول سے قبل چونکہ پڑھنا اور لکھنا نہیں آتا تھا اس لئے اس گمان کی گنجائش بھی نہ تھی کہ جو کچھ وہ سنا رہے ہیں وہ آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ کا اپنا بیان اور تصنیف ہے۔ آقائے نامدار ﷺ سے فرمایا گیا کہ لوگوں کو یہی دلیل دیں:

قُل لَّوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَا تَلَوْتُهُۥ عَلَيْكُمْ وَلَآ أَدْرَىٰكُم بِهِۦ ۖ

''آپ (ﷺ) فرمائیں ''اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں یہ (قرآنِ مجید) نہ سناتا اور نہ وہ تمہیں اس کی خبر دیتا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِۦٓ ۚ

اس لئے کہ میں تو اس سے قبل ایک عمر تمہارے درمیان رہ چکا ہوں (اس وقت تو میں نے تمہیں کتاب نہیں سنائی تھی)

أَفَلَا تَعْقِلُونَ o

کیا تم عقل وفکر سے کام نہیں لیتے (اس نکتے پر غور وفکر نہیں کرو گے، اس فرق کو نہیں دیکھتے)؟'' (یونس۔۱۶)

آقائے نامدار ﷺ پر قرآنِ مجید نازل فرمایا گیا تو ان کا فوری ردِعمل یہ تھا:

ءَامَنَ ٱلرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيۡهِ مِن رَّبِّهِۦ

''رسول ایمان لائے اس پر جو ان کے رب کی جانب سے نازل فرمایا گیا'' (حوالہ البقرۃ۔۲۸۵)

اور آقائے نامدار ﷺ سے لوگوں کو واضح اور دوٹوک انداز میں سمجھانے کیلئے اس بات کو یوں بتانے کیلئے کہا

وَقُلۡ ءَامَنتُ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِن كِتَٰبٖۖ

''اور آپ (ﷺ) کہیں ''میں اس پر ایمان لایا جو اللہ نے کتاب (قرآنِ مجید) میں نازل کیا ہے'' (حوالہ الشوریٰ۔۱۵)۔

اور اسی سورۃ کی آیت ۵۱ میں یہ حقیقت بتائی ''اور کسی بشر کیلئے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر بذریعہ وحی، یا آڑ، رکاوٹ کے پیچھے سے، یا کوئی رسول بھیجے اور وہ اس کی اجازت سے اور جو وہ چاہے وہ وحی کرے۔ وہ عالی مرتبہ اور دانا ہے''۔ اور پھر فرمایا

وَكَذَٰلِكَ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ رُوحٗا مِّنۡ أَمۡرِنَاۚ

''اور اسی طرح (رسول کے ذریعے اور افق اعلیٰ سے اوپر قربتوں کے مقام پر خود)
ہم نے آپ (ﷺ) کی طرف اپنے امر کی روح (قرآنِ مجید) وحی کیا ہے

مَا كُنتَ تَدۡرِي مَا ٱلۡكِتَٰبُ وَلَا ٱلۡإِيمَٰنُ

آپ (ﷺ) اس کوشش میں نہیں تھے کہ (نزول) کتاب اور اس پر ایمان لانا کیا ہے'' (حوالہ الشوریٰ۔۵۲)

ایک ٱلنَّبِيِّ ٱلۡأُمِّيِّ کو کتاب عطا فرما کر رسالت کے فرائض سونپے جا رہے ہیں اور لوگوں کو غیر مبہم انداز میں پہلے یہ واضح کیا گیا کہ آپ (ﷺ) تو اس جستجو/امید میں نہ تھے کہ آپ کو کتاب عنایت کی جائے۔ ''تَرۡجُوٓاْ'' کا مادہ ''ر ج و'' ہے جس کے معنی ''امید'' ہیں (یاس/ناامیدی کی ضد) (تاج)۔ بالعموم یہ ایسی امید کو کہتے ہیں جو موہوم نہ ہو۔ ''تَدۡرِي'' کا مادہ ''د ر ي'' ہے اور ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا قصد کرنا اور اسے طلب کرنا ہیں۔ ادراک کا مفہوم کسی بات کو جان لینا، اس سے آگاہ ہونا ہیں۔ اور کسی بھی بات کو جاننے اور پانے کیلئے اس کا ''پیچھا'' کرنا پڑتا ہے، اس کیلئے قصد اور جستجو کرنی پڑتی ہے۔ ایک ان پڑھ بندہ حقیقت کی جستجو میں تو ہوتا ہے لیکن کتاب کی جستجو میں نہیں کیونکہ کتاب تو اسے پڑھنا ہی نہیں آتی۔ ٱلنَّبِيِّ ٱلۡأُمِّيِّ آقائے نامدار ﷺ ذاتی طور پر اس امید اور جستجو میں نہیں تھے کہ ان پر کتاب نازل کی جائے گی اور سورۃ الشوریٰ میں کھول کر بتا دیا کہ قرآنِ مجید ان کی ذاتی خواہش اور کاوش کا نتیجہ نہیں ہے کہ آقائے نامدار ﷺ کی ذات اقدس سے کوئی اسے منسوب کر سکے۔ آقائے نامدار ﷺ تو یہ جاننے کی کوشش میں بھی نہیں تھے کہ نزولِ کتاب اور اس پر ایمان لانا کیا ہوتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ رحمت نازل فرمائی تو اس پر ایمان

لانے اور قرآنِ مجید کے حوالے سے سرِ تسلیم خم کرنے والے اول مسلم وہی تھے۔ ''آپ (ﷺ) فرمائیں ''اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں یہ (قرآنِ مجید) نہ سناتا اور نہ وہ تمہیں اس کی خبر دیتا۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِۚ اس لئے کہ میں تو اس سے قبل ایک عمر تمہارے درمیان رہ چکا ہوں''

زیرِ بحث نکتے کو زیادہ گہرائی میں سمجھنے کیلئے آقائے نامدار رسول کریم ﷺ کی گفتگو کو آئیں انتہائی انہماک سے سنیں:

قُلْ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِن كُنتُمْ فِى شَكٍّ مِّن دِينِى فَلَآ أَعْبُدُ ٱلَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ

''آپ (ﷺ) بتائیں ''اے لوگو! اگر میرے دین (طریقے) کے متعلق تم شک میں ہو تو
میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو،

وَلَـٰكِنْ أَعْبُدُ ٱللَّهَ ٱلَّذِى يَتَوَفَّىٰكُمْ ۖ

بلکہ میں اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے'' (حوالہ یونس۔۱۰۴)

رسولِ کریم ﷺ اپنے دین کے متعلق ہم الناس کو بتا رہے ہیں۔ اور اس وقت قریش مکہ کو بتا رہے تھے کہ وہ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ پر ہیں یعنی صرف اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور آپ کا دین ان کی طرح کا نہیں ہے۔ آقائے نامدار ﷺ نے اہلیان مکہ کی اکثریت کو وہ بات بتائی جو آپ ﷺ اور ان کے درمیان حد فاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ کو مشرکین مکہ بھی مانتے تھے اور اسے ہی خالق، رازق اور مالک مانتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کو بھی اِلٰہ سمجھتے تھے اور پرستش کرتے تھے ''میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو''۔

رسولِ کریم ﷺ نے اپنے دین کے متعلق واضح فرمایا اور قرآنِ مجید کے نزول پر انہیں جو حکم ملا تھا اس کے متعلق ارشاد فرمایا

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ

''اور مجھے کہا گیا تھا کہ میں (نازل کردہ پر) ایمان لانے والوں میں ہو جاؤں''

وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا

اور یہ (مجھے حکم دیا گیا ہے) کہ ''اپنا منہ دین پر قائم کئے رکھ حَنِيفًا

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝

اور مشرکوں میں ہرگز نہ ہو جانا'' (حوالہ یونس۔۱۰۴۔۱۰۵)۔

اور آپ ﷺ کو جس نازل کردہ پر ایمان لانے کیلئے کہا گیا تھا اس کے متعلق لوگوں کو یہ بتانے کیلئے فرمایا:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ

آپ (ﷺ) فرمائیں ''اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق (قرآنِ مجید) آ گیا ہے

فَمَنِ ٱهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِى لِنَفْسِهِۦ ۖ

اب جو راہ ہدایت پر چلا وہ اپنے (فاہدے کے) لئے چلے گا

وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ

اور جو غافل ہوا تو وہ اپنے خلاف ہی بھٹکے گا

وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ۝

اور میں تمہارا کچھ ذمہ دار (وکیل) نہیں'' (یونس۔۱۰۸)

رسولِ کریم ﷺ سے فرمایا گیا کہ پہلے لوگوں کو اپنے دین کے متعلق بتائیں اور پھر انہیں اس حکم کے متعلق بتائیں جو انہیں نزولِ قرآنِ مجید پر ملا ہے۔ اور آقائے نامدار ﷺ نے اس حکم کو عین انہی الفاظ میں دہرایا جن میں یہ حکم ملا تھا فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ

''اس لئے اپنا منہ دین پر قائم کئے رکھ حَنِيفًا'' (حوالہ الروم۔۳۰)

حَنِيفًا بندے ہی کو جو ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ پر قائم ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پر ثابت قدم رہے اور جس بناء پر وہ

حَنِيفًا ''صرف اللہ ہی کو اِلٰہ ماننے والا'' نہیں رہے گا اُس سے اُسے منع کیا جائے گا۔ ارفع، مثبت بات پر قائم و دائم رہنے کی نصیحت کی جاتی ہے اور پست، منفی بات کے متعلق کہا جاتا کہ جس طرح ماضی میں اختیار نہیں کیا ویسے ہی حال اور مستقبل میں بھی اُسے اختیار نہ کرنا اور اس انداز بیان سے نہ صرف ارفع اور پست، مثبت اور منفی نکھر کر واضح ہو جاتے ہیں بلکہ ارفع، مثبت بات کی اہمیت زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے رسولِ کریم ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ ایمان لانے والوں میں ہو جاؤں اور وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝ اور مشرکوں میں ہرگز نہ ہو جانا'' (حوالہ یونس۔۱۰۴۔۱۰۵)۔ اس کے موقع محل کے متعلق وضاحت یہ ہے

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَٰبًا فِى قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾

''اے رسولِ کریم (ﷺ)! اور اگر ہم نے آپ پر (قرآنِ مجید) نازل کیا ہوتا لکھا ہوا کاغذوں پر

اور لوگوں نے اُس (لکھے ہوئے قرآنِ مجید) کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھ بھی لیا ہوتا

تب بھی جنھوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے'' (الانعام۔۷)

قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ ۖ

آپ (ﷺ پرانی بات بتانے کیلئے) فرمائیں "اور مجھے کہا گیا تھا کہ میں (قرآنِ مجید کے نزول پر) اول بنوں جس نے تسلیم کیا"

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝

اور یہ کہ "مشرکوں میں ہرگز نہ ہوجانا" (حوالہ الانعام۔۱۴)

وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا۠ أَوَّلُ ٱلْمُسْلِمِينَ ۝

"اور یہی مجھے کہا گیا تھا اور میں تسلیم کرنے والوں میں سب سے اول ہوں" (حوالہ الانعام۔۱۶۳)

زیر بحث نکتے کو زیادہ واضح طور پر سمجھنے کیلئے سورۃ النمل، الزمر اور سورۃ غافر کی اس نکتے رموضوع پر آیات کو پڑھتے ہیں

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ ٱلْبَلْدَةِ ٱلَّذِى حَرَّمَهَا وَلَهُۥ كُلُّ شَىْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ
أَكُونَ مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ﴿٩١﴾ وَأَنْ أَتْلُوَا۟ ٱلْقُرْءَانَ ۖ فَمَنِ ٱهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِى لِنَفْسِهِۦ ۖ
وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُنذِرِينَ ﴿٩٢﴾

"مجھے کہا گیا تھا کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے محترم بنایا ہے، اور جو ہر شئے کا مالک ہے،
اور مجھے کہا گیا تھا کہ میں تسلیم کرنے والوں میں ہوجاؤں اور یہ کہ قرآن (مجید) سناؤں"۔
(آپ ﷺ نے سنا دیا ہے، یہ "قول" پہنچا دیا ہے) اس لئے جو راہ پر چلا وہ صرف اپنے لئے چلے گا
اور جو کوئی غافل ہوگیا تو آپ بتا دیں "میں تو صرف خبردار کرنے والوں میں سے ہوں" (النمل۔۹۱۔۹۲)

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ فَٱعْبُدِ ٱللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ ٱلدِّينَ ﴿٢﴾

ہم نے آپ (ﷺ) پر کتاب (قرآنِ مجید) حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ اور آپ اللہ کی بندگی کریں اُسکے دین کیلئے مخلص رہتے ہوئے

قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ ٱللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ ٱلدِّينَ ﴿١١﴾

آپ (ﷺ) کہیں "مجھے کہا گیا تھا (حوالہ سورۃ الزمر کی آیت ۲) کہ میں اللہ کی بندگی کروں اس کے دین سے مخلص رہتے ہوئے"

وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ ٱلْمُسْلِمِينَ ﴿١٢﴾

اور مجھے کہا گیا تھا (الانعام آیت۔۱۴ قرآنِ مجید کے نزول پر) کہ تسلیم کرنے والوں میں سب سے اول میں ہوں"

قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّى عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٣﴾

آپ (ﷺ) کہیں "اگر میں اپنے رب کی بات تسلیم کرنے سے (اُس وقت) انکار کرتا تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"

قُلِ ٱللَّهَ أَعۡبُدُ مُخۡلِصٗا لَّهُۥ دِينِي ﴿١٤﴾

آپ (ﷺ) کہیں ''میں تو اللہ کی بندگی کرتا ہوں اس کیلئے مخلص رہتے ہوئے اپنے دین میں

فَٱعۡبُدُواْ مَا شِئۡتُم مِّن دُونِهِۦۗ قُلۡ إِنَّ ٱلۡخَٰسِرِينَ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓاْ أَنفُسَهُمۡ وَأَهۡلِيهِمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِۗ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ ٱلۡخُسۡرَانُ ٱلۡمُبِينُ ﴿١٥﴾

اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوائے تم لوگ جس کی چاہو غلامی کرو''

آپ (ﷺ) انہیں (یہ بھی) بتائیں ''نقصان اٹھانے والے وہ ہیں

جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو روز قیامت کو نقصان میں ڈالا۔ سنو! یہی حقیقی نقصان ہے۔'' (الزمر۔۲، ۱۱۔۱۵)

قُلۡ إِنِّي نُهِيتُ أَنۡ أَعۡبُدَ ٱلَّذِينَ تَدۡعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ لَمَّا جَآءَنِيَ ٱلۡبَيِّنَٰتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرۡتُ أَنۡ أُسۡلِمَ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٦٦﴾

''آپ (ﷺ) کہیں ''مجھے منع کیا گیا تھا، جب میرے رب کی جانب سے واضح آیات (قرآنِ مجید) آئی تھیں، کہ ان کی غلامی کروں

جنہیں تم لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ اور مجھے کہا گیا تھا کہ میں سارے جہانوں کے رب کا فرمانبردار رہوں'' (غافر۔۴۰)

ان سورۃ النمل، الزمر اور سورۃ غافر کی آیات مبارکہ سے واضح ہے کہ آقائے نامدار ﷺ سے قرآنِ مجید کے نزول پر کہا گیا تھا کہ اِس کو تسلیم کرنے میں اول آپ ﷺ ہوں اور منع فرمایا تھا کہ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ کے سوائے جنہیں لوگ پکارتے ہیں ان کی عبادت نہیں کرنا، یعنی مشرکوں میں نہیں ہونا بلکہ اپنے ماضی کی طرح بندگی کرتے رہیں اُس کیلئے مخلص رہتے ہوئے اپنے دین میں۔ اور آپ ﷺ سے فرمایا گیا تھا کہ اپنے دین اور روش کے متعلق لوگوں کو بتا دیں اور انہیں قرآنِ مجید سنا دیں اور واضح کر دیں کہ آپ کے ذمہ انہیں غفلت سے بیدار کرنا ہے۔ اس لئے ان سے یہ کہنے کیلئے بھی کہہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے جس کی چاہے وہ لوگ غلامی کرتے رہیں لیکن نتیجے کے ذمہ دار خود ہوں گے اور خود ہی بھگتیں گے۔ ''أُمِرۡتُ'' امر سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد متکلم ہے۔ (فعل ماضی مجہول بنانے کیلئے پہلے حرف پر پیش اور دوسرے حرف پر زیر ہو جاتا ہے)۔ ''مجھے یہ کرنے کیلئے کہا گیا تھا، حکم دیا گیا تھا''۔ رسولِ کریم ﷺ بتا رہے ہیں کہ انہیں فلاں فعل کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ یہ کب کہا گیا تھا اور اس فعل کا تعلق کس بات سے تھا اُسے اس سے واضح کر دیا ''اور یہ کہ قرآنِ مجید لوگوں کو سناؤں''۔ ''عَصَيۡتُ'' بھی ماضی کا صیغہ واحد متکلم ہے۔ اس کے معنی کسی کی بات کو تسلیم کرنے، ماننے سے انکار کرنا ہیں۔ عربی لفظ ''نُهِيۡتُ'' بھی واحد متکلم ماضی مجہول کا صیغہ ہے ''مجھے منع کیا گیا تھا''۔ کب منع کیا تھا؟ یہ اس وقت (فعل نہی) منع کیا گیا تھا جب

ایک امر کیلئے کہا گیا تھا یعنی جب آپ ﷺ پر قرآنِ مجید نازل ہونا شروع ہوا تھا۔ ''لَمَّا'' کے معنیٰ ''جب'' ہیں۔ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡيَنَ ''اور جب وہ مدین کے پیاؤ پر پہنچے'' (حوالہ القصص۔۲۳)۔ اس طرح واضح ہے کہ ''لَمَّا'' اسم ظرف ہے اور ''حِيۡنَ'' کا ہم معنی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''لَمَّا'' '' اِذْ '' کی طرح کا ہوتا ہے۔ '' اِذْ '' کا مدخول بھی جملہ ماضیہ ہوتا ہے اور ''لَمَّا'' کا بھی۔ ''لَمَّا'' کی جزاء کا فعل ماضی ہونا بالاتفاق صحیح ہے۔ جَآءَ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے اور قرآنِ مجید کیلئے ہمیشہ مذکر الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ''دِيۡنِىۡ'' میں دِيۡنِ مضاف، ''ی'' ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ معنیٰ ''میرا دین، طریقہ''۔

آقائے نامدار، نبی امی ﷺ جب منصب رسالت پر فائز کر دیئے گئے تو قرآنِ مجید کے نزول کے اول دن سے لوگوں کو اپنے دین یعنی طریقے کے متعلق بتاتے ہوئے ان سے مطالبہ کرتے تھے کہ اب تو قرآنِ مجید بھی نازل ہو گیا ہے اس لئے میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ اس دین کو اپنا لو وگرنہ نتیجے کے خود ذمہ دار ہو گے۔ آقائے نامدار ﷺ چونکہ ان میں سے نہیں تھے جو بات کو جبر اور زبردستی سے اس انداز سے منواتے ہیں کہ دوسرے کو گراں گزرے اس لئے واضح کر دیا کہ لوگوں کی اپنی مرضی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے جس کی چاہے عبادت اور غلامی کرتے رہیں۔ اور اس بات کو قرآنِ مجید کے اختتامی خطاب میں بھی دوٹوک انداز میں دہرا دیا

قُلۡ يٰٓاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾

''آپ (ﷺ) فرمائیں ''اے (میری) دعوت کا انکار کرنے والو!

لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾

میں ان کی غلامی نہیں کرتا جن کی تم پرستش کرتے ہو

وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۳﴾

اور نہ تم اس کی بندگی کرو گے جس کی بندگی میں کرتا ہوں

وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾

اور نہ میں اس کی غلامی کروں گا جن کی تم پرستش کرتے ہو

وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾

اور نہ تم اس کی بندگی کرو گے جس کی بندگی میں کرتا ہوں

لَـكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ ﴿۶﴾

تمہارا دین تمہارے لئے ہے اور میرا دین میرے لئے'' (الکافرون۔۱۔۶)

آقائے نامدار ﷺ اپنی حیات طیبہ کے اول دن سے جس دین پر قائم تھے اور آپ ﷺ کے دین اور اکثر لوگوں کے دین میں بنیادی فرق اور حد فاصل کو واضح اور کھلے ترین الفاظ میں تمام انسانیت کیلئے بیان کر دیا ہے۔ آپ ﷺ کو قرآنِ مجید کے نزول کی ابتدا پر اپنے جس دین پر پہلے کی طرح اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ مخلص رہنے کیلئے کہا گیا تھا آپ ﷺ نے دعوت اور خبردار کئے جانے کا انکار کرنے والوں کے سامنے برملا اعلان فرما دیا ہے۔

آقائے نامدار ﷺ نے اسلام کو پہلی مرتبہ کائنات میں متعارف نہیں کرایا۔ آپ ﷺ سے قبل اسلام اور مسلمان دونوں موجود رہے تھے۔ فرعون نے بھی ڈوبتے وقت نعرہ لگا دیا تھا أَنَا۟ مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ''میں مسلمانوں میں سے ہوں''۔ قرآنِ مجید کے نزول سے قبل آپ ﷺ اور مکۃ المکرّمہ میں بعض دوسرے لوگ (جیسے سیدنا خدیجہ رضی اللہ تعالہ عنھا) بھی مسلمان تھے۔ ان لوگوں کیلئے اصطلاح ''حنیف'' مروج تھی جس کے معنی ایسے دین پر قائم و دائم لوگ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کو اِلٰہ مانتے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے، توحید، اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والے۔ اس بات کیلئے روایت اور تاریخ کی شہادت کی ہمیں ضرورت قطعی نہیں اور نہ ان کا مقام و مرتبہ ہے کہ کسی بات کے متعلق حتمی یقین سے کوئی بات کہہ سکیں اور دوسرے کو یقین دلا سکیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں صاحب علم نہیں ہوں اس لئے جس نکتے پر ہم بحث کر رہے ہیں ممکن ہے بعض کو تشنگی کا احساس ہو کیونکہ اہل علم کی طرح بیان اور اظہار کی میرے پاس قدرت رصلاحیت نہیں اس لئے آیات مبارکہ کے الفاظ کی نفاستوں پر آپ خود توجہ مرکوز فرمائیں۔ آقائے نامدار ﷺ کے مبعوث فرمائے جانے اور قرآنِ مجید کے نزول پر اس زمانے میں موجود مسلمانوں پر لازم تھا کہ آپ ﷺ اور قرآنِ مجید پر ایمان لائیں۔ اور انہوں نے ایسا کیا بھی تھا۔

ٱلَّذِينَ ءَاتَيْنَٰهُمُ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِهِۦ هُم بِهِۦ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾

''جن کو ہم نے اس (قرآنِ مجید) سے قبل کتاب دی تھی وہ اس کو مانتے ہیں۔ (القصص۔۵۲)

وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِهِۦٓ إِنَّهُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّنَآ إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِۦ مُسْلِمِينَ ﴿٥٣﴾

اور جب انہیں یہ (قرآنِ مجید) سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ''ہم اس پر ایمان لائے، یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، ہم تو اس سے قبل بھی مسلمان تھے'' (القصص۔۵۲۔۵۳)

''یُتْلٰی'' واحد مذکر غائب مضارع مجہول ''جب یہ قرآنِ مجید پڑھا جاتا ہے''۔ قرآنِ مجید لازوال تفسیر حقیقت ہے۔ یہ تمام انسانیت کیلئے ہے جن میں مجھ جیسے کم فہم لوگ بھی موجود ہیں۔ اس لئے قرآنِ مجید نفیس اور باریک نکات کو بھی آسان فہم بنا دیتا ہے۔ ابراہیم اور

اسماعیل علیہم السلام نے کعبہ کی تعمیر کی ابتدا پر دعا مانگی تھی اور اللہ تعالیٰ کے اَلْبَيْتِ کی تعمیر مکمل ہونے پر جلیل القدر باپ بیٹے نے موقع کی عظمت کے شایان شان جو مانگا تھا اس سے زیادہ مانگنے کیلئے کچھ تھا بھی نہیں۔ آئیں غور سے سنیں

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ

''یارب! آپ ہم (باپ بیٹے) کو اپنے دو مسلمان بنائیں

[مُسْلِمًا اسم فاعل، واحد مذکر، اسلام مصدر۔ مُسْلِمَيْنِ اسم فاعل تثنیہ مذکر]

وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

اور ہماری ذریت (نسل، اولاد) میں سے اپنی ایک مسلمان امت بنا''

[مُّسْلِمَةً اسم فاعل، واحد مؤنث] (حوالہ البقرۃ۔۱۲۸)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِكَ (حوالہ البقرۃ۔۱۲۹)

''ہمارے رب! (ہماری) اس اولاد کے درمیان مبعوث فرما ایک رسول اسی (امت مسلمہ) میں سے جو انہیں تیری آیات سنائے''

باپ بیٹا یعنی ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام اکٹھے دعا مانگ رہے ہیں وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اس لئے اس دعا میں التماس چونکہ اولاد کے حوالے سے ہے اس لئے ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں تو دوسری اولاد اسحاق علیہ السلام بھی شامل ہیں لیکن اسماعیل علیہ السلام کی دعا کا تعلق ان کی اپنی اولاد سے ہوگا۔ لیکن آخر میں مسلم امت بننے والی اپنی اولاد، نسل میں سے ان کے درمیان صرف ایک رسول کو مبعوث کرنے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں جس کا ایک ہی مطلب ہے کہ دعا کی اس بات میں باپ بیٹے کی سانجھ ہے یعنی وہ رسول اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو۔ اللہ کے جلیل القدر ان دو بندوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں آخری رسول خاتم النبیین مبعوث فرمایا جائے۔ ان کی دعا کے الفاظ کے معنی اور مفہوم ہم عجمی جو چاہے سمجھتے رہیں لیکن جس کو سنائے گئے تھے اس نے ان کے معنی اور مفہوم واضح کر دیئے تھے کہ زمان و مکاں کو معلوم ہے کہ ان باپ بیٹے کی دعا کو شرف قبولیت بخشا گیا تھا کہ اسماعیل علیہ السلام کی مسلم اولاد اور نسل میں صرف ایک رسول آقائے نامدار ﷺ کو خاتم النبیین مبعوث فرمایا گیا ہے۔ اللہ رب العزت نے اپنے خلیل اور اپنے لئے بصد شوق ذبح ہو جانے کو مان لینے والے کی بات مان لی تھی لیکن ہم پر تو اُس کا یہ احسان عظیم ہے۔ دوستو! آئیں ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام اور رسول کریم ﷺ کے رب کو ایک سجدہ شکر کریں

آقائے نامدار ﷺ فرائض رسالت تفویض کئے جانے سے قبل حَنِيفًا اور قرآنِ مجید کے نزول پر اول حَنِيفًا مُّسْلِمًا ہیں۔

آقائے نامدار، رسولِ کریم ﷺ پر درود وسلام ہے ہر لمحہ صبح وشام۔ یارب! تو سچ کہتا ہے کہ مَا قَدَرُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ ہم نے اللہ کی وہ قدر نہیں کی جتنی اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ یارب! تو ہمیں معاف فرما! تیری قدر کا ادراک تو تب کرتے اگر ہم تیری اس عظیم تخلیق، عظیم بندے کے مقام ومرتبہ کو سمجھ پاتے۔ تو ان کی عمر کی قسم کھاتا ہے (لَعَمْرُكَ تیری عمر، زندگی کی قسم حوالہ الحجر۔۷۲) اور ایک ہم ہیں کہ اُن ﷺ کی عمر کو خانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔

حَنِيفًا انسان کی اوج ہے۔ اور شرک انسان کو پستیوں میں گرا دیتا ہے۔ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ ''اللہ اِلٰہ ہے'' کی دائمی حقیقت پر یقین جب تک غیر متزلزل رہتا ہے وہ آسمان کی رفعتوں میں ہوتا ہے

وَمَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ ٱلسَّمَآءِ

''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے تو وہ ایسے ہے جیسے آسمان سے گر گیا''۔

اِلٰہ سے اپنا تعلق ارادہ واختیار سے جس انسان نے جب خود منقطع کر لیا تو اس کی حیثیت ووقعت کیا رہ جاتی ہے؟ اس مثال سے واضح فرمایا

فَتَخْطَفُهُ ٱلطَّيْرُ

''پھر چاہے پرندے اس پر جھپٹ پڑیں

أَوْ تَهْوِى بِهِ ٱلرِّيحُ فِى مَكَانٍ سَحِيقٍ

یا ہوا دور دراز جگہ پر اسے جا پھینکے'' (حوالہ الحج۔۳۱)۔

اسماعیل علیہ السلام اور آقائے نامدار ﷺ کے مابین پشت در پشت زمان کا ایک طویل فاصلہ ہے اور واضح رہے کہ آقائے نامدار ﷺ نے بنی اسماعیل ہی کو قرآنِ مجید کے ذریعے سب سے پہلے خبردار کرنا تھا

لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّآ أُنذِرَ ءَابَآؤُهُمْ فَهُمْ غَٰفِلُونَ ﴿٦﴾

''تاکہ آپ (ﷺ) (سب سے پہلے) اس قوم (نسل اسماعیل علیہ السلام) کو خبردار کریں جن کے باپ دادا کو خبردار نہیں کیا گیا اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں'' (یٰس۔۶)

حرف 'ف' ترتیب بیان کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے یعنی یہ ہوا، پھر یہ ہوا، پھر یہ ہوا۔ یہ تعقیب کیلئے بھی ہوتا ہے یعنی ایک واقعہ کے بعد جتنی

مدت میں دوسرا واقعہ ہوتا ہو اس مدت میں وہ ہو جائے تو اس کا اظہار بھی حرف ''ف'' سے کرتے ہیں۔ دو واقعات کے مابین حرف ''ف'' کا استعمال ہوتا ہے جب قبل والا واقعہ بعد والے واقعہ کا سبب ہو۔ اور حرف ''ف'' واؤ عاطفہ یعنی ''اور'' کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حرف 'ف' کے استعمال کے جس کسی انداز کو اپنایا جائے مفہوم ایک ہی واضح ہوگا کہ ان کی غفلت کی وجہ کسی رسول کا نہ آنا اور اس کے نتیجے میں ان کے پاس کتاب کی عدم موجودگی تھی اور یوں اَلْأُمِّيِّـۧنَ تھے۔ زمان میں انسان اور مختلف قوموں کے رویئے سے آگاہی ہونے کی بناء پر ہمارے لئے ان کے بگاڑ اور غفلت کو سمجھنے میں کوئی حیرانگی اور پیچیدگی نہیں۔ لیکن یہ سوال اہم ہے کہ درمیانی عرصے میں کسی بھی خبردار کرنے والے کے نہ آنے کی وجہ سے بنو اسماعیل (علیہ السلام) میں مسلم کہلانے کا پیمانہ کیا ہے؟ مسلم وہ تھا جو رب العالمین کو إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ مانتا تھا یعنی شرک نہیں کرتا تھا کہ تمام رسولوں کا بنیادی پیغام بس یہ تھا

قَالَ يَـٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـٰهٍ غَيْرُهُۥٓ

انہوں نے کہا ''اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی اِلٰہ نہیں''۔

انسانوں میں مسلمین اور مجرمین کے تعین کرنے کا بنیادی پیمانہ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ کا اقرار اور انکار ہے اور ایمان اور کفر کی تقسیم اس وقت وجود میں آتی ہے جب اللہ کا رسول دعوت دیتا ہے کہ وہ اللہ کا چنا اور مختص کیا ہوا بندہ ہوتا ہے جو شروع ہی سے حَنِيفًا اور پابندِ میثاق ہوتا ہے۔ اور حَنِيفًا کی ضد، متضاد مشرک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے چنے، مختص کئے ہوئے بندے، نبی اور رسول لوگوں کو خبردار کرنے کے فرائض تفویض کئے جانے سے قبل بھی لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ کے ابدی دین پر ہونے کی بناء پر مسلم ہوتے ہیں۔ اور پھر جو ان پر نازل فرمایا جاتا ہے اس پر سب سے اول وہ خود سر تسلیم خم کرتے (فرمانبردار، مسلم بننا) ہیں اور بغیر کسی اجر کے لوگوں کو خبردار کرنے کا فریضہ ادا فرماتے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے قوم سے فرمایا تھا

فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ ۖ

''لیکن اگر تم (اللہ کی نازل کردہ آیتوں سے) منہ موڑتے ہو تو میں نے تم سے کوئی اجرت تو نہیں مانگی۔
میری اجرت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْمُسْلِمِينَ ۝

اور مجھے کہا گیا تھا کہ میں تسلیم کرنے والوں میں ہو جاؤں'' (یونس۔۷۲)

قرآنِ مجید میں حَنِيفًا کے بتائے ہوئے معنی کو سمجھنے میں تشنگی نہ رہے اور تسلیم کرنے میں تذبذب نہ ہو اس لئے ان تمام آیات

مبارکہ کو ترتیب سے پڑھ لیتے ہیں جہاں یہ استعمال ہوا ہے۔

وَقَالُواْ كُونُواْ هُودًا أَوۡ نَصَٰرَىٰ تَهۡتَدُواْۗ

''اور وہ (اہل کتاب) کہتے ہیں'' یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تو ہدایت پاؤ گے''

قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ إِبۡرَٰهِـۧمَ حَنِيفٗاۖ

آپ (ﷺ) کہہ دیں ''نہیں (وہ ہدایت نہیں)، حقیقت میں ہدایت ابراہیم (علیہ السلام) حَنِيفًا کا طریقہ (راستہ اختیار کرنے اور اس کی ملت میں شامل ہونے میں) ہے'' (حوالہ البقرۃ۔۱۳۵)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دوست کے متعلق بتایا

مَا كَانَ إِبۡرَٰهِيمُ يَهُودِيّٗا وَلَا نَصۡرَانِيّٗا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفٗا مُّسۡلِمٗا

''ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ حَنِيفًا مسلم تھے'' (حوالہ آلِ عمران ۶۷)

وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ۝

''اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا'' (البقرۃ ۱۳۵، آلِ عمران ۸۷)۔

یہ حقیقت اس قدر اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سچ ہونے پر کائنات کے صادق سے بھی تصدیق کرنے کیلئے کہا

قُلۡ صَدَقَ ٱللَّهُۗ فَٱتَّبِعُواْ مِلَّةَ إِبۡرَٰهِيمَ حَنِيفٗاۖ وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ﴿٩٥﴾

''آپ (ﷺ) کہیں ''اللہ نے سچ کہا ہے'' اس لئے اے لوگو تم ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقے کی پیروی کرو جو حَنِيفًا تھے اور مشرکوں میں سے وہ نہ تھے'' (آلِ عمران۔۹۵)

اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! ہمارے بس میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور آقائے نامدار ﷺ کے تعلق، محبتوں اور قربتوں کا ادراک کر سکیں۔ رب العالمین، عالمین کے صادق سے فرما رہے ہیں کہ وہ کہیں کہ اللہ نے سچ کہا ہے۔ سبحان اللہ!

ابراہیم علیہ السلام حَنِيفًا تھے اور جب انہیں منصب رسالت پر فائز کیا گیا تو اپنے پر نازل کردہ پر ایمان لانے، سر تسلیم خم کرنے والے سب سے اول وہ خود تھے۔

إِذۡ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسۡلِمۡۖ قَالَ أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿١٣١﴾

''جب اس کے رب نے اسے کہا ''تسلیم کر'' تو اس نے کہا ''جہانوں کے رب کا میں فرمانبردار ہوتا ہوں'' (البقرۃ۔۱۳۱)۔

اور یوں حَنِيفًا مُّسْلِمًا کہلاتے ہیں۔ حَنِيفًا وہ بندہ ہے جو ابتدا ہی سے اور ہمیشہ مشرک کے متضاد ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق سورۃ النحل کی آیت ۱۲۰ میں اس حقیقت کو یوں منکشف فرمایا

إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٠﴾

''یقیناً ابراہیم (علیہ السلام) ہمہ صفت موصوف تھے، ہمیشہ اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے حَنِيفًا، یعنی کبھی بھی مشرکوں میں سے نہ تھے'' (النحل۔۱۲۰)

قَانِتًا قنوت سے اسم فاعل ہے اور اس کا مادہ ''ق ن ت'' ہے جس کے معنی کھڑا ہونا ہیں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْقُنُوْتُ سے مراد کسی کام کو دوام اور التزام سے کرنا اور استقامت رکھنا ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۃ الروم کی آیت ۲۵ میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم (امر) سے آسمان اور زمین (تَقُوْمَ) کھڑے ہیں اور آیت ۲۶ میں فرمایا کہ ''اور تمام اللہ تعالیٰ کیلئے (قٰنِتُوْنَ) کھڑے ہیں''۔ آسمان اور زمین کے کام میں دوام، التزام اور استقامت ہے۔ اور ہمیں حکم دیا ''وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ'' اور اللہ کیلئے کھڑے ہو دوام، التزام اور استقامت کے ساتھ'' (حوالہ البقرۃ۔۲۳۸)۔ اللہ تعالیٰ کے رسول حَنِيفًا مُّسْلِمًا ہیں اور ایمان لانے والوں سے کہا جاتا ہے کہ مُسْلِمًا حَنِيفًا رہیں آخر دم تک۔ ابراہیم علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ''اس لئے تم مت مرنا سوائے اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو'' (حوالہ البقرۃ۔۱۳۲)۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے کہا ''وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور تم مت مرنا سوائے اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو'' (حوالہ آلِ عمران۔۱۰۲)۔ ابراہیم علیہ السلام ابتدا ہی سے قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيفًا تھے اور ہمیں ان کی وصیت پر عمل کرنے کا کہا گیا کہ ہم بھی ایمان لانے کے بعد دوام، التزام اور استقامت سے مرتے دم تک اس پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا مخلص بندہ حَنِيفًا ہوتا ہے اور ابتدا ہی سے ہمیشہ کیلئے مشرک کا غیر ہوتا ہے۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔ حُنَفَآء جمع ہے حنیف کی اور غیر ہے مشرکین کی (حوالہ الحج۔۳۱)۔ مشرکین بھی اللہ کو مانتے ہیں لیکن اس کے علاوہ مختلف نام اختراع کر کے تراشے ہوئے اصنام کو دیتے ہیں اور پھر انہیں بھی اِلٰہ قرار دے کر پرستش کرتے ہیں اور یوں وہ یکسو اور مخلص نہیں ہوتے۔ حَنِيفًا یکسو اور مخلص ہوتا ہے اور اس میں کھوٹ کی ملاوٹ قطعی نہیں ہوتی۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ﷺ ''آپ (ﷺ) کہہ دیں ''نہیں (وہ ہدایت نہیں)، حقیقت میں ہدایت ابراہیم (علیہ السلام) حَنِيفًا کا طریقہ (راستہ اختیار کرنے اور اس کی ملت میں شامل

ہونے میں) ہے"۔اور مِلَّةَ کوابراہیم علیہ السلام سے مخصوص کر کے جب ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ کوقرار دیا جائے تو اس کے معنی و مفہوم ،طریقہ،راستہ اور اس ذریعہ ہدایت کی حقیقت ،تعارف ، پہچان کیا ہے؟ اللہ رب العزت نے آقائے نامدار ﷺ سے ان تمام باتوں کی وضاحت یوں فرمانے کیلئے کہا

قُلْ إِنَّنِى هَدَىٰنِى رَبِّىٓ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا

"آپ (ﷺ) بتائیں" مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف راہ دکھادیا ہے جوایک صحیح دین ہے،

ابراہیم (علیہ السلام) حَنِيفًا کا طریقہ" (حوالہ الانعام۔۱۶۱)۔

صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ کیا ہے؟ یہ دِينًا قِيَمًا ہے اور دِينًا قِيَمًا کیا ہے؟ مِّلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ہے۔اب اگر صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ کے متعلق معلوم ہوجائے کہ یہ کونسا راستہ اور طریقہ ہے تو تمام اصطلاحوں کے معنی اور مفہوم نکھر کر واضح ہوجائیں گے۔

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَٰمِ

"ہاں! جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے راہ دکھادے اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے"۔

وَهَٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا

"اور یہ اسلام ہے تیرے رب کا راستہ سیدھا" (حوالہ الانعام آیت ۱۲۵،۱۲۶)۔ اور بتایا گیا

إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ

"اللہ کے نزدیک دین تو صرف اسلام ہے" (حوالہ آلِ عمران۔۱۹)

اس کے باوجود کوئی کسی غلط فہمی میں نہ رہے بتادیا گیا کہ

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ

"اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور طریقہ کار تلاش کرے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا" (حوالہ آلِ عمران۔۸۵)

ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ کی اصطلاح میں دوسرے لفظ ٱلْقَيِّمُ کا مادہ "ق و م" ہے اور اس کے معنی ہیں کھڑا ہونا، اعتدال اور توازن پر ہونا، ثابت اور دائم رہنا۔

إِنَّ عِدَّةَ ٱلشُّهُورِ عِندَ ٱللَّهِ ٱثۡنَا عَشَرَ شَهۡرٗا فِي كِتَٰبِ ٱللَّهِ

''یقیناً مہینوں کی گنتی اللہ کی جانب سے، اللہ کی کتاب میں، بارہ مہینے ہے

يَوۡمَ خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ مِنۡهَآ أَرۡبَعَةٌ حُرُمٞۚ

اس دن سے جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت کے ہیں''۔

ہماری کائنات کی تخلیق کی ابتدا سے جس شئے، بات، حقیقت، اصول، نظام، فطرت شئے، طریقے کو ثبات اور دوام ہے اس کو قرار دیا

ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُۚ

''یہ ہے ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُ ''۔(حوالہ سورۃ التوبہ۔۳۶)

سیدنا یوسف علیہ السلام نے بھی قید خانے کے ساتھیوں کو ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُ کی تعریف بتائی تھی۔

إِنِ ٱلۡحُكۡمُ إِلَّا لِلَّهِۚ

'' حاکمیت صرف اللہ کیلئے ہے۔

أَمَرَ أَلَّا تَعۡبُدُوٓاْ إِلَّآ إِيَّاهُۚ

اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو''۔

حقیقت ابتدا سے یہی ہے اور اسے دوام ہے کہ اس کے متعلق فرمایا

ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُ

''یہ ہے ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُ ''(حوالہ سورۃ یوسف۔۴۰)۔

اس بنیادی اور دائم حقیقت کے منافی روش، طریقہ، معاشرت کی حیثیت انہیں یہ بتائی تھی

مَا تَعۡبُدُونَ مِن دُونِهِۦٓ ''اس اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو

إِلَّآ أَسۡمَآءٗ سَمَّيۡتُمُوهَآ أَنتُمۡ وَءَابَآؤُكُم وہ محض مؤنث نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں

مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلۡطَٰنٍۚ اللہ نے اس کی کوئی سند نازل نہیں کی''(حوالہ سورۃ یوسف۔۴۰)۔

قرآنِ مجید کائنات کی منفرد کتاب ہے۔ یہ تفسیر حقیقت اور کتابِ مبین ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں کو اس کھلے انداز میں واضح

کرتا ہے کہ سامع اور قاری کو کسی حقیقت کا ادراک کرنے میں تشنگی کا احساس نہ رہے۔ بات کو بیان کرنے پر گرفت اور قدرت رکھنے کی میری کمزوری تصور کریں اگر حَنِيفًا کے معنی اور مفہوم سمجھنے میں تشنگی کا احساس ہو۔ حَنِيفًا ایسا شخص نہیں ہوتا جو گمراہی سے استقامت کی طرف مائل یا غلط راستے سے ہٹ (مڑ) کر سیدھی راہ پر آتا ہے بلکہ وہ اَلدِّينُ اَلْقَيِّمُ یعنی ''اللہ اِلٰہ ہے'' حاکمیت صرف اللہ کیلئے ہے''، ''اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو'' پر ابتدا ہی سے قائم ہوتا ہے۔

حَنِيفًا اسم فاعل ہے۔ اور وہ فاعل ہے اَلدِّينُ اَلْقَيِّمُ کا۔ اَلْقَيِّمُ صیغہ صفت ہے، ثبات اور دوام ازل سے۔

حَنِيفًا اور اَلدِّينُ اَلْقَيِّمُ میں مماثلت اور نسبت

وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ''(مجھے کہا گیا تھا) اور یہ کہ اپنا منہ دین پر قائم کئے رکھوں حَنِيفًا'' (حوالہ یونس۔۱۰۵)

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ''اس لئے اپنا منہ دین پر قائم کئے رکھیں حَنِيفًا'' (حوالہ الروم۔۳۰)

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ اَلْقَيِّمِ ''اس لئے اپنا منہ دین اَلْقَيِّمِ پر قائم کئے رکھیں'' (حوالہ الروم۔۴۳)

أَقِمْ امر کا صیغہ ہے، واحد مذکر حاضر اور جنہیں یہ حکم دیا گیا وہ ذات اقدس آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ ہیں۔ اور اس لفظ کا مادہ بھی ''ق و م'' ہے جس کے بنیادی معنی توازن کو قائم رکھنے، ثبات اور دوام کے ہیں۔ اس لئے جب کسی کو کسی امر کے متعلق کہا جائے أَقِمْ تو اس کے معنی اور مفہوم یہ نہیں جس سے یہ اخذ ہو کہ اُسے اس امر کی ابتدا کرنے کا کہا گیا ہے یعنی ''فلاں کام کر لے، یا فلاں کام کر'' جس امر کیلئے أَقِمْ کہا جائے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسے یہ حکم دیا گیا ہے وہ اس پر پہلے سے قائم ہے اور اسی پر اسے قائم، ثابت قدم رہنے کا کہا گیا ہے۔ حَنِيفًا کے معنی ایک ایسا شخص (اسم فاعل) ہے جو اَلدِّينُ اَلْقَيِّمُ یعنی اس حقیقت پر پہلے سے قائم ہوتا ہے کہ ''اللہ اِلٰہ ہے'' حاکمیت صرف اللہ کیلئے ہے''، ''اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں''۔ اور اگر اللہ تعالیٰ حَنِيفًا پر وحی نازل فرمائے، اسے رسول مبعوث فرمائے، کتاب عطا فرمائے تو سب سے اول اس پر وہ ایمان لاتے، سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس وحی کے حوالے سے اول مسلم، مومن کہلاتے ہیں۔ اور ان کی ابتدا اور آخر کو یکجا کر کے انہیں حَنِيفًا مُّسْلِمًا کہتے ہیں۔

اشیاء کے مابین تعلق (relationship) کے تعین کا نام علم ہے۔ اور اس اظہارِ شئے کو ہم اس کی فطرت کہتے ہیں۔ اور شئے کے تعلق (relationship) کی وسعت کا جس قدر اظہار ہوتا جائے گا اس کی حقیقت اتنا ہی واضح اور حیطہ ادراک میں آتی جائے

گی۔ یہ مادہ کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ ہے۔لیکن ذات، ہستی، ذی حیات کی بنیادی صفت یہ ہے کہ اپنے وجود کا اظہار وہ خود کرے۔ کیا ہستی اپنا احساس، ادراک تعلق، رشتے کے اظہار یعنی فطرت کے بغیر کرا سکتی ہے؟ جواب نفی میں ہے۔ سورۃ الروم میں فرمایا ''فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا''۔ اس قدر ثبات اور دوام کے ساتھ اَلدِّينُ اَلْقَيِّمُ (اللہ الٰہ ہے) پر اپنے آپ کو قائم رکھنے پر اصرار کیوں ہے؟ اس لئے کہ ہستی اللہ ہے۔ اور اس ہستی کا اظہار، تعلق، نسبت، فطرت یہ ہے کہ تمہارا اِلٰہ ہے۔ اگر فطرت شئے جانے بغیر مادے کی حقیقت کو نہیں پا سکتے تو بنیادی اور اہم ترین تعلق (فطرت) سے انکار کر کے اللہ تعالیٰ کو کیسے جان سکو گے؟ یہ اصرار اس لئے ہے

فِطْرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِى فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيْهَا

''یہ اللہ کی ہستی کا اظہار ہے جس پر اس نے انسان کو تخلیق کیا ہے''۔

خالق اللہ ہے اور انسان اس کی تخلیق۔ دونوں کے مابین تعلق (relationship) فَطَرَ عدم سے تخلیق کا ہے۔ فَاطِرِ اور مخلوق کا تعلق ہے۔ اور یوں اللہ نے اپنی ذات کا اظہار انسان کے ساتھ اس تعلق سے کیا کہ وہ ان کا اِلٰہ ہے۔

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ ٱللَّهِ

''اللہ کی تخلیق کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا''

ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ

''یہ ہے اَلدِّينُ اَلْقَيِّمُ''۔

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

''لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے'' (سورۃ الروم آیت۔۳۰)۔

آیت مبارکہ میں ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ سے قبل کہی گئی تینوں باتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کہ ان میں ثبات، دوام اور عدم تبدیلی کا اظہار ہے۔ اور سورۃ التوبہ کی ۳۶ اور سورۃ یوسف کی آیت ۴۰ میں ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ کے متعلق فرمان کو اس کے ساتھ ملا کر ایک نظر دیکھیں تو اَلدِّينُ اَلْقَيِّمُ اور فطرت کے معنی و مفہوم بیک وقت واضح ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کا یہ اظہار کہ وہ اِلٰہ ہے اس تعلق سے ہوا کہ وہ فَاطِرِ، خالق ہے۔ فَطَرَ (مادہ ''ف ط ر'') کے معنی پھاڑنا، شق کرنا لیکن پہلی مرتبہ کی خصوصیت اس کے بنیادی معنوں میں شامل ہے۔ اس لئے فَطَرَ کے معنی کسی چیز کو پہلی مرتبہ کرنا ہیں۔

قرآنِ مجید میں یہ لفظ پہلی بار سورۃ الانعام کی آیت ۱۴ میں رسولِ کریم ﷺ سے کہلوایا گیا

قُلْ أَغَيْرَ ٱللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ

(آپ ﷺ ان سے) کہیں ''اللہ کو جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست (ولی) بنالوں''۔

اور دوسری بار یہ لفظ الانعام کی آیت ۷۹ میں آیا ہے اور آقائے نامدار ﷺ کے جدامجد ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوا تھا

إِنِّى وَجَّهْتُ وَجْهِىَ

''میں نے اپنا چہرہ، رخ کیا ہوا ہے

لِلَّذِى فَطَرَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ حَنِيفًا ۖ

اس کی جانب جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، حَنِيفًا ،

وَمَآ أَنَا۠ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝

اور میں مشرکوں میں سے نہیں''

فطرت کے عام طور پر لئے جانے والے معنی اور مفہوم سے ایک غلط فہمی پر مبنی تاثر یہ ہے کہ ہر شئے کی طرح اللہ رب العزت اور انسان کی بھی انہی معنی اور مفہوم میں ایک فطرت ہے۔ فَطَرَ کے بنیادی معنی عدم سے تخلیق کرنا ہیں اور یہ تخلیقی فعل شئے کو وجود دینے کے ساتھ اظہار ہے ہستی کے وجود کا۔ ذات اور تخلیق کردہ شئے میں بنیادی فرق ارادے کا ہے۔ اور تخلیق ارادے کو وجود دینے کا نام ہے اور نتیجہ، اظہار ہے وہ شئے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ یٰس کی آیت ۸۲ میں فرمایا

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾

''جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کیلئے کہتا ہے ''ہوجا'' اور وہ ہوجاتا ہے''۔

اس لئے اشیاء (مادہ) کی فطرت کے جو معنی اور مفہوم ہیں انہیں ذات، ہستی کے حوالے سے فطرت نہیں کہا اور سمجھا جا سکتا۔ ارادہ مقصد لئے ہوتا ہے اس لئے جو شئے تخلیق ہوگی وہ اس مقصد کی تکمیل کا سامان اپنے اندر سموئے ہوئے ہوگی۔ اور مقصد کی تکمیل کا جو سامان اس شئے میں پنہاں ہے وہ اس کی فطرت ہے۔ فَاطِرِ ، خالق شئے کی تخلیق کے مقصد کے حوالے سے اس کی فطرت مرتب کرتا ہے اور انسان اس کے دوسری اشیاء اور خود اس کی ذات کے ساتھ تعلق کو ظاہری نگاہ سے دیکھ کر اس کی فطرت کو ایک حد تک جان سکتا ہے لیکن تفکر جو کہ اصل دیکھنا ہے اس کے وجود کی حقیقت، مقصد کو عیاں کر دے گا۔ حقیقت شئے انسان کو حقیقت بتائے گی۔ فرمایا

أَفَرَءَيۡتُمُ ٱلۡمَآءَ ٱلَّذِي تَشۡرَبُونَ ﴿٦٨﴾ ءَأَنتُمۡ أَنزَلۡتُمُوهُ مِنَ ٱلۡمُزۡنِ أَمۡ نَحۡنُ ٱلۡمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾

''کیاتم نے کبھی اس پانی کو دیکھا (تفکر کر کے اس کی حقیقت کو جانا) ہے جو تم پیتے ہو؟

کیاتم نے اسے بادل میں سے اتارا ہے یا ہم اتارنے والے ہیں؟

لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنَٰهُ أُجَاجٗا فَلَوۡلَا تَشۡكُرُونَ ﴿٧٠﴾

اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں، پھر تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟'' (الواقعة ۶۸ـ۷۰)۔ الحمد لله

حَنِيفًا یکسو اور مخلص ہوتا ہے اور اس میں کھوٹ کی ملاوٹ قطعی نہیں ہوتی اور اپنی اس روش پر دوام، التزام اور استقامت سے قائم رہتا ہے۔

وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا لِيَعۡبُدُواْ ٱللَّهَ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ

''اور انہیں (اہل کتاب) صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی اس کے دین کے ساتھ مخلصانہ یکسوئی سے کریں

وَيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤۡتُواْ ٱلزَّكَوٰةَۚ

اور نماز پر قائم رہیں اور زکوٰۃ ادا کریں''۔

اور اللہ رب العزت نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنایا

وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلۡقَيِّمَةِ ۝

''اور یہی دین قیم ہے'' (البینة ـ ۵)۔

حَنِيفًا ایسا شخص نہیں ہوتا جو گمراہی سے استقامت کی طرف مائل یا غلط راستے سے ہٹ (مڑ) کر سیدھی راہ پر آتا ہے بلکہ وہ ابتداہی سے ٱلدِّينُ ٱلۡقَيِّمُ پر قائم ہوتا ہے یعنی ''اللہ الہٰ ہے'' حاکمیت صرف اللہ کیلئے ہے'' مانتا ہے۔ اور ایمان لانے والوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ وہ حَنِيفًا رہیں یعنی شرک نہ کریں۔ اہل کتاب کو یہی حکم دیا گیا تھا لیکن وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ اگر وہ اسلام کی دعوت قبول نہ کریں تو انہیں ایک نکتے کی دعوت دی جائے

قُلۡ يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ تَعَالَوۡاْ إِلَىٰ كَلِمَةٖ سَوَآءِۭ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ

کہو! ''اے اہلِ کتاب! آجاؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے

(ابراہیم اور عیسیٰ علیہم السلام کے حکم کے حوالے سے)

أَلَّا نَعۡبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهِۦ شَيۡـٔٗا وَلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا أَرۡبَابٗا مِّن دُونِ ٱللَّهِۚ

کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ کسی چیز کو اس کا شریک کریں اور نہ ہم
اللہ کے سوا اپنے میں سے بعض کو دوسروں کے ارباب بنائیں'' (حوالہ آلِ عمران۔۶۴)۔

اور یہی معنی اور مفہوم ہے حَنِيفًا کا۔ بندگی کا صلہ حیات ہے جس کے تسلسل کی خواہش ماند نہیں پڑے گی اور شرک کی سزا بھی حیات ہے جس کا ہر لمحہ موت کی خواہش میں بیتے گا لیکن آئے گی نہیں۔ یارب! بے لوث محبت اور احسان کے جواب میں بے وفائی کی یہ سزا کہ زندگی تڑپ بن جائے عین انصاف ہے۔